لغوی منہج تفسیر کی روشنی میں علامہ رحمت اللہ طارق کی تفسیر میزان القرآن کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

Research and critical study of Tafsīr Mīzān ul Qur‘ān by Allāma Rahmatullah Tāriq in the light of lexical methodology of Quranic Exegesis

Muhammad Soban
Doctoral Candidate, Department of Islamic Learning, University of Karachi
Email: soban.muhammad921@gmail.com

Dr. Muhammad Atif Aslam Rao
Assistant Professor, Department of Islamic Learning, University of Karachi
Email: dratifrao@uok.edu.pk

ISSN (P):2708-6577
ISSN (E):2709-6157

Abstract

The literal interpretation of the Holy Qur ʻān is the interpretation that is made taking the dictionary into account while interpreting the Holy Qurʻān. Without a doubt, the dictionary is an essential source of Quranic exegesis. However, the entire interpretation cannot be based only on the dictionary. Acceptable and unacceptable both aspects are found in the lexical interpretations. The satisfactory element is to present Hadiths or signs to support the description. In contrast, the unacceptable pattern of the literal interpretation is the opposite. This article is aimed to evaluate the exegesis 'Meezan ul Qur ʻān ' by Allāma Rahmatullah Tariq from these two aspects, as he has used the dictionary repeatedly in his commentary. The paper begins with a brief yet comprehensive autobiography of Allāma Rahmatullah Tāriq, followed by an introduction to the Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān. Then, the article details the methodology Allāma Tāriq adopted for the exegesis of the Holy Qur ʻān. The paper mainly deals with the various words of the Holy Qur ʻān and their lexical discussion, which begins with the chapter-wise pattern of interpretation and examples from chapters 1 and 2 of the exegesis. The article concludes with a summary of the research and some valuable suggestions from the researchers. The series of literal interpretations started from the time of the Holy Prophetﷺ. And it continued till the present. The research presented in the article is an endeavour to present a review of Urdu commentaries which were affected by this lexical methodology.

Keywords: *Tafsīr (exegesis), Tafsīr Mīzān ul Qur ʻān, Exegetical views, Allāma Rahmatullah Tāriq , lexical methodology, Urdu commentaries.*

تمہید: قرآن پاک کی تفسیر کرتے ہوئے لغت کو مد نظر رکھنا لغوی منہج تفسیر کہلاتا ہے۔ بلاشبہ تفسیر قرآن میں لغت ایک اہم ماخذ ہے لیکن محض لغت ہی کی بنا پر مکمل تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ لغوی تفسیر میں محموداور مذموم دونوں پہلوؤں کو ذیلی اقسام کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔ محمود پہلو تو وہ ہو گا جس میں لغوی تفسیر کی تائید میں احادیث یا آثار پیش کیے جا سکیں جبکہ تفسیر لغوی کا مذموم پہلو اس کے برعکس ہے۔ زیر بحث تفسیر تفسیر میزان القرآن کا انہی دو اعتبارات سے جائزہ لینا مقصود ہے کیوں کہ علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی اس

تفسیر میں لغت سے جابجا استفادہ کیا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اس بات کا جائزہ مقصود ہے کہ یہ تفسیر لغوی منہج کی کس حیثیت سے عکاسی کرتی ہے۔ مقالہ کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں:

1۔ علامہ رحمت اللہ طارق کا سوانحی خاکہ

2۔ تفسیر میزان القرآن کا تحقیقی مطالعہ

علامہ رحمت اللہ طارق کا سوانحی خاکہ[1]

علامہ رحمت اللہ طارق کی پہچان ملتان شہر سے ہے لیکن یہ ان کا آبائی علاقہ نہیں ہے۔ ان کی پیدائش 28 فروری 1929ء کو صوبہ بلوچستان کے ضلع جھل مگسی میں ہوئی۔ آپ کے والد الحاج عطا محمد مگسی اپنے دیندار مزاج کے باعث سجادہ نشین شیخ عبد القادر جیلانی، نقیب زادہ بغداد سعید احمد بغدادی کے انتہائی مقربین میں سے تھے۔ انہوں نے الحاج عطا محمد کو اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ ایک سند اعزاز عطا کی تھی جس پر درج تھا: "حاجی عطا محمد مگسی ہمارے خاص الخاص معتقدین اور مریدین کے زمرہ میں شامل ہے۔ ایک بزرگ ہستی ہے، خدا پرست ہے، بدیوں سے بچا ہوا ہے، اور خدا سے لو لگا رکھی ہے۔ اس کا سینہ موتیوں کی طرح روشن ہے۔"

علامہ رحمت اللہ طارق نے مولانا غلام مصطفی قاسمی (سابق چیئرمین رویئت ہلال کمیٹی) سے اکتساب علم کیا۔ مزید حصولِ تعلیم کے لیے آپ ملتان آئے یہاں مولانا عبد التواب صدیقی سے سند امتیاز حاصل کی۔ علامہ رحمت اللہ طارق نے انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد آزادی میں علامہ مشرقی کی قیادت میں خاکسار تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور جلد ہی آپ کے قریبی رفقاء میں شمار ہونے لگے۔ خاکسار تحریک کے مشن پر ہی آپ کلکتہ تشریف لے گئے۔ یہاں کے کتب خانوں نے آپ کی شخصیت میں کتب بینی سے والہانہ لگاؤ پیدا کر دیا۔ سرسید احمد خان کی تفسیر قرآن کے مطالعے نے آپ کی سوچ میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی اور آپ نے علامہ مشرقی کے جریدے "الاصلاح" میں باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔ تمنا عمادی نہ صرف آپ کی تحقیق کے معترف ہوئے بلکہ اسماء الرجال کے فن میں انہوں نے آپ کو اپنا جانشین قرار دے دیا۔ 1954ء میں آپ نے جامعہ ام القریٰ مکہ معظمہ میں داخلہ لیا اور تخصص فی الحدیث کی ڈگری حاصل کی۔ یہیں سے ہی اجازۃ الروایت کی ڈگری بھی حاصل کی۔ یہاں آپ کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ دوران تعلیم آپ نے مسئلہ ناسخ و منسوخ کا تفصیلی مطالعہ کیا اور نسخ فی القرآن کا ہر زاویہ سے تجزیہ کیا، پھر "منسوخ القرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو قرآنیات کے اس موضوع پر ایک منفرد اور اہم کاوش ہے۔ اس کتاب کی تکمیل پر آپ علامہ ناصر الدین البانی کی دعوت پر شام تشریف لے گئے جہاں آپ کے کام کو خوب پذیرائی ملی۔ پاکستان میں انہوں نے ایک تحقیقی ادارہ بھی " ادارہ ادبیات اسلامیہ " کے نام سے قائم کیا۔ علامہ رحمت اللہ طارق کی مزید چند اہم تصانیف کے نام درج ذیل ہیں۔

تفسیر میزان القرآن، لباس اور چہرہ کیسا ہونا چاہیے، مصوری، موسیقی اور اسلام، عورت اور مسئلہ امارت، تصور حور و غلماں، قربانی کی شرعی حیثیت، رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ جاگیریں، مسلمان مفکرین کے معاشی نظریات، قرآن کا معاشی نظریہ، اسلامی سوشل ازم، فنونِ لطیفہ اور اسلام، ابن حزم کا موسیقی نامہ، عورت اور مسئلہ امارت، قتل مرتد کی شرعی حیثیت۔

وفات: علامہ رحمت اللہ طارق 6 شعبان المعظم بمطابق 3 اکتوبر 2003 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

تفسیر میزان القرآن کا تعارف:

علامہ رحمت اللہ طارق کی تفسیر "تفسیر میزان القرآن" ایک مختصر اور قرآن کریم کی منتخب آیات کی تفسیر ہے۔ اس تفسیر میں انہوں

نے بنیادی طور پر چنیدہ مقامات کی شرح کی ہے چناں چہ اس تفسیر کے سرورق پر علامہ رحمت اللہ طارق رقم طراز ہیں: "میزان القرآن یعنی اس حقیقت کے اظہار میں بلاغت، ادب، گرائمر، لسانیات اور اصناف سخن اور مفاہیم کے جس زاویے سے بھی قرآن محکم کا جائزہ لیجیے جہاں تک انسانی فہم کی رسائی کا تعلق ہے تو اس میں نہ کوئی ادبی خامی ہے نہ لسانی سقم، محاورات کی کمزوری ہے اور نہ ہی مفاہیم کا بحران۔ ایسے میں ہمارے کج فکر مفسرین کا مفاہیم کو گیند کی طرح اچھالنا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ اتنی بڑی جسارت تو ان لوگوں نے بھی نہیں کی جن کے شعر وادب اور ان کی شعری نزاکتوں کو چیلنج کرنے کے لیے قرآن مقابل میں آیا تھا اور انہوں نے اپنی زبان ہونے کے ناطے قرآن کو یقین اور ہر زاویے سے کھنگالا ہو گا مگر انہیں کہیں تضاد نظر نہیں آیا نہ لسانی سقم، نہ مفہوم کی خامی، نہ فصاحت و بلاغت کے معیار میں ناپختگی۔ تو پھر یہ راز اہل عجم پر کیسے منکشف ہوئے؟ ہم نے کتاب ہٰذا میں مخالفین کی توجیہات کا اس زاویے سے جائزہ لیا کہ ان لوگوں نے اعتراضات کا جو طلسمی ہیکل کھڑا کیا ہے اس کی علمی، ادبی، لسانی اور مفہوماتی کوئی بھی حیثیت نہیں ہے۔ پڑھیے اور قرآن سے انصاف کیجیے۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ علامہ رحمت اللہ طارق ایسی تفسیر کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں ایک جداگانہ طرز اختیار کیا جائے جو ماضی میں کہیں نہ ملتا ہو۔

تفسیر میزان القرآن میں علامہ رحمت اللہ طارق کا منہج و اسلوب:

بنیادی طور پر مؤلف نے اس تفسیر کو دو ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

باب اول:

باب اول میں علامہ صاحب نے سورتوں کی ترتیب سے منتخب آیاتِ قرآنیہ سے چیدہ چیدہ کلمات کی تفسیر کی ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ یہ باقاعدہ تفسیر نہیں ہے بلکہ صرف ان آیات کے مخصوص حصوں کی تفسیر ہے جن کی تفہیم یا تطبیق کے حوالے سے کوئی بظاہر پیچیدگی یا اشکال تھا، صرف انہیں مقامات کے حوالے سے علامہ صاحب نے اعتراض کا عنوان قائم کر کے اعتراض نقل کیا ہے پھر "قول فیصل" کے عنوان کے تحت اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ چناں چہ علامہ لکھتے ہیں: "تفسیر منسوخ القرآن اور برہان القرآن کے بعد ایک ایسی تفسیر کی ضرورت تھی جو مختصر بھی ہو اور دفاع قرآن کے موضوع پر جامع بھی۔ چناں چہ اسی غرض کے لیے میزان قرآن کے عنوان سے تفصیلی باب میں ایک نیا اضافہ کیا گیا۔ جس میں 528 آیات کو زیر بحث لایا گیا اس طرح 528 عنوانات ہی مباحث کی پہچان بنائے گئے ہیں اور اس پر باب دوم کے مقالات مستزاد ہیں۔"[2]

گویا ان کا مقصد اس تفسیر سے صرف ان موضوعات یا مقامات کو ذکر کرنا ہے جن پر کسی قسم کا کوئی اشکال یا پیچیدگی ہے تو وہ ان اعتراضات کا اپنے نقطہ نظر کے مطابق جوابات دے کر قرآن کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے اپنی اس تفسیر میں منتخب 528 آیات قرآنیہ کی ہی تفسیر کی ہے جس میں سوال وجواب کے انداز میں اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند مثالیں درج ذیل ہیں جو ان کے منہج و اسلوب کی عکاس ہیں۔

باب اول میں علامہ صاحب کا اسلوب و منہج:

مس اور رد کے استعمال میں فرق:

وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ[3] **ترجمہ: اور اگر اللہ تمہیں ضرر اور نقصان**

سے دوچار کردے۔

وجہ اعتراض: میں کہا جاتا ہے کہ "ضرر" کو "مس" کے اور بھلائی کو "ارادے" کے فعل سے بیان کرنے میں کیا راز ہے؟

قول فیصل: مکمل آیت کے دوسرے حصے میں ''ولارادلفضله'' کا فقرہ ہے۔ لہذا "مس" کو "راد" کے تناظر میں دیکھنا چاہیے تو واضح ہو گا کہ "مس" اس وقت استعمال ہوتا ہے جب امر واقع ہو چکا ہو اور "راد" اس وقت کہا جاتا ہے جب واقع ہی نہ ہوا ہو۔ اس طرح پوری آیت کے معنیٰ ہوں گے: ترجمہ: اگر اللہ اپنے قانون کے مطابق تمہیں نقصان سے دوچار کرے تو اسے دور کرنے والا کوئی نہیں اور اگر بھلائی کرے تو اسے روکنے والا نہیں۔[4]

ایک مقام پر علامہ صاحب تصویر کشی، موسیقی اور طربیہ رقص کے متعلق لکھتے ہیں:

فنون لطیفہ اور مصوری کا فروغ

يَعْمَلُوْنَ لَه مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رَّاسِيَاتٍ[5] ترجمہ: جو وہ چاہتا اس کے لیے بناتے تھے قلعے اور تصویریں اور حوض جیسے لگن اور جمی رہنے والی دیگیں۔

وجہ اعتراض: میں کہا جاتا ہے کہ تصویر سازی حرام ہے اسے اللہ کی نعمتوں میں شمار نہ ہونا چاہیے۔

قول فیصل: قرآن بھیجنے والے خدا نے یہ آیت نازل فرماتے وقت اگر جناب رازی سے مشورہ کر لیا ہوتا تو یہ الجھن پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ خیر سوچ کی سطح اپنی اپنی ہوتی ہے۔ یہ لوگ وہی مانیں گے جو ان کے اکابر نے انہیں سمجھا دی ہے۔ لیکن "صورت گری" نہ صرف آج بھی روا ہے ہماری ضرورت بھی ہے اسے حرام کہنے والا کون ہوتا ہے۔ تفاصیل و دلائل کے لیے ملاحظہ ہو، مصوری موسیقی اور طربیہ رقص... تحریر بندہ۔[6]

باب دوم میں علامہ رحمت اللہ طارق کا اسلوب و منہج:

علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی تفسیر میزان القرآن کے اس دوسرے باب میں قرآنی الفاظ واقعات کے مفہوم اور مراد کے متعلق اپنے منفرد نقطہ نظر کو نہایت تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے کل 14 موضوعات کو بیان کیا ہے۔ درج ذیل امثلہ سے باب دوم میں ان کا اسلوب سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

وادی نمل کی ہوشیار ملکہ:

اس عنوان کے تحت انہوں نے قرآن پاک میں مذکور نمل کے متعلق اپنا مؤقف واضح کیا ہے اور اس بات پر دلائل پیش کیے ہیں کہ نمل چیونٹی کے معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد کوئی انسان ہے۔[7]

فرعون ذی الاوتاد کا تعمیراتی معجزہ:

اس عنوان کے تحت علامہ رحمت اللہ طارق نے ذی الاوتاد سے "کیلوں والا" کی بجائے "بھاری بھرکم عمارات" مراد لیا ہے۔[8]

قوم ثمود جس نے چٹانیں کھرچ کر رہائش کا منفرد انداز اپنایا:

اس مضمون میں انہوں نے قوم ارم کے متعلق اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ نیز قوم عاد کی قد و قامت کے متعلق بھی اپنی تحقیق بیان کی ہے۔ جس میں انہوں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے قد کھجور کے تنوں کی مانند لمبے نہیں تھے بلکہ اس سے مراد ان کی مضبوطی ہے کہ وہ بہت طاقت ور قوم تھی۔[9]

موسیٰ اور فرعون:

اس میں انہوں نے حضرت موسی علیہ السلام اور فرعون کے مقابلے کے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے۔اس مضمون کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں علامہ رحمت اللہ طارق نے حضرت موسیٰ کو عطا کردہ معجزات میں تاویل کی ہے۔وہ معجزات کے حوالے سے جمہور اہل اسلام کے نظریے سے متفق نہیں ہیں لہذا انہوں نے تفصیل سے اپنے مؤقف کو واضح کیا ہے۔[10]

ذوالکفل۔گوتم بدھ:

اس عنوان کے تحت علامہ رحمت اللہ طارق نے بیان کیا ہے کہ قرآن پاک میں مذکور ذوالکفل دراصل گوتم بدھ ہیں۔[11]

سید البشر ﷺ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر کیا تھی:

اس کے تحت علامہ رحمت اللہ طارق نے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ نکاح کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر 27یا28سال تھی۔پھر ضمناً یہ بھی ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی صاحبزادیاں چار تھیں۔حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمۃ الزہراء۔چناں چہ علامہ صاحب نے اس دعویٰ کا سختی سے رد کیا ہے کہ حضرت فاطمہ آپ ﷺ کی صرف ایک صاحبزادی تھیں۔[12]

سید البشر ﷺ سے شادی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر کیا تھی:

اس عنوان کے تحت انہوں نے اس بات کو عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ نکاح کے وقت سیدہ عائشہ صدیقہ کی عمر 6یا9سال نہیں تھی۔بلکہ ان کی عمر اس وقت تقریباً19برس تھی۔[13]

قرآن پر تصوف اور روایات کی ہمہ جہتی یلغار:

اس عنوان سے ہی یہ بات واضح ہے کہ علامہ صاحب نے کس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔چناں چہ پہلے تو انہوں نے سنت رسول ﷺ کی حیثیت کو چیلنج کیا ہے اور سنت رسول ﷺ کو حجت ماننے سے انکار کیا ہے اور پھر انہوں نے تصوف کا بھرپور رد کیا ہے۔جس میں انہوں نے متقدمین اور متاخرین صوفیا پر سخت تنقید کی ہے۔[14]

علامہ رحمت اللہ طارق نے لغوی تفسیر کو خاصی اہمیت دی ہے۔بہت سے مقامات پر انہوں نے سلف کی تفسیر لغوی کو ہی لیا ہے اور تقریباً انہی معانی کو نقل کیا ہے۔تاہم بہت سے مقامات پر انہوں نے سلف اور جمہور کے ذکر کردہ معانی سے الگ روش اختیار کرتے ہوئے ایک نیا معنیٰ اختیار کیا ہے۔جس کی چند مثالیں ذیل کے صفحات میں ذکر کی گئی ہیں۔

وارث کے معنیٰ:

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ۔[15] ترجمہ:اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور اخیر مالک بھی ہم ہی ہیں۔اس آیت کی تفسیر کے تحت رحمت اللہ طارق نے وارث کے معنی باقی رہنے والے کیے ہیں۔چناں چہ وہ رقم طراز ہیں:"وارث لغت میں باقی رہنے والے کو بھی کہتے ہیں۔یعنی سب تو فانی ہوں گے وہ حی و قیوم کی حیثیت سے باقی رہے گا، اور اللہ ان کے مال و املاک بلکہ ہر شئ کا جس طرح پہلے مالک تھا سب کے فنا ہو جانے کے بعد بھی باقی اور مالک رہے گا"۔[16]علامہ رحمت اللہ طارق نے مندرجہ بالا آیت میں مذکور لفظ وارث کا معنی باقی رہنے والا کیا ہے۔

غل کا معنیٰ:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ[17] ترجمہ:"اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب دور کر دیں

گے سب بھائی بھائی ہوں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھنے والے ہوں گے"۔اس آیت کی تفسیر کے تحت غل کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:غل کے معنی کفر کے نہیں ہیں۔بغض،حسد،اور دل کی کدورت جس میں مسلمان اور کافر برابر ہیں کے ہیں۔یہاں بتلانا یہ مقصود ہے کہ اہل جنت کے دلوں سے رشک وحسد کا جذبہ ختم ہو گا اور چونکہ وہاں اونچ پنچ نہ ہو گی،لہذا یہ جذبہ خسیس پروان نہیں چڑھے گا سبھی اعتماد اور باہمی احترام کے یکساں حامل ہوں گے۔[18]

یعنی غل کے معنی کفر کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد دل میں پیدا ہونے والی وہ تمام بری کیفیات ہیں جن میں مسلمان اور کافر سب برابر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل جنت کے مابین کوئی فرق نہیں ہو گا بلکہ باہم احترام کی فضا ہو گی۔

امر کا معنٰی:

امرنا مترفیهاففسقوا فیها[19] کے تحت علامہ صاحب رقم طراز ہیں:

وجہ اعتراض: یہ ہے کہ آیۂ زیر بحث میں واقع " امرنا" سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے خود ہی برائی کی راہ پر چلنے کا لوگوں کو حکم دے رکھا ہے۔

قول فیصل: امر کے معنی لغت میں کثرت کے ہیں یعنی ہم نے خوشحال لوگوں کو مال ودولت مویشیوں اور جائیداد کی کثرت سے نوازا۔لیکن انہوں نے اسے بدی کی راہ پر چلنے کا ذریعہ بنایا۔اس طرح" ففسقوا"میں واقع حرف فا جزاء ہے خوشحالی کی۔یعنی"ففسقوا" کے فاعل وہ خود تھے جس سے واضح ہوتا ہے کہ بدی کا راستہ ان کا خود پسند کردہ راستہ ہے اللہ سبحانہٗ بدی کا حکم نہیں دیتے۔فرمایا: ان اللہ لا یامر بالفحشاء والمنکر [20]" اللہ نہ فحش کا حکم دیتے ہیں نہ دیگر منکرات کا"۔[21] علامہ رحمت اللہ طارق نے اس آیت میں امر کا معنی کثرت اور تعداد بڑھانے کا کیا ہے۔وہ کثرت خواہ مال واولاد کی ہو یا مویشیوں کی۔

استغفار کا معنٰی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے والد کو بت پرستی سے منع کیا اور اسے شیطانی عمل قرار دیا تو حضرت ابراہیم کے والد کو اس سے سخت ناگواری ہوئی چناں چہ کہنے لگے کہ تم اگر ہمارے بتوں کو برا بھلا کہو گے تو میں تمہیں سخت سزا دوں گا بالآخر ابراہیم علیہ السلام کو اپنے سے دور ہو جانے کا کہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيۡ[22] ترجمہ:"اب میں اپنے رب سے تیری بخشش کی دعا کروں گا"۔اس آیت میں استغفار کا معنی بیان کرتے ہوئے علامہ صاحب لکھتے ہیں:یہاں استغفار سے مراد دست سوال دراز کرنا ہے۔یعنی دعا کرنی ہے کہ اے اللہ اسے ایمان اور اسلام قبول کرنے کی توفیق نصیب فرما۔[23]علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں استغفار سے مراد باری تعالیٰ کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہے۔

جبال کا معنٰی:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ جبال کا لفظ استعمال کیا ہے۔چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا وَيَسْاَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا۔[24]ترجمہ:"ہم خوب جان لیں گے جو کچھ وہ کہیں گے جب ان میں سے بڑا سمجھدار کہے گا کہ تم صرف ایک ہی دن ٹھہرے ہو۔اور تجھ سے پہاڑوں کا حال پوچھتے ہیں سو کہہ دے میرا رب انہیں بالکل اڑا دے گا"۔علامہ صاحب جبال کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"یہاں یوم کا لفظ نکرہ کے مقام پر آیا ہے جسے کھینچ تان

کر معرفہ بنانے کا تکلف بے جواز ہے۔ کیوں کہ یہاں ماضی کے فراعنہ اور حال کے قوم موسیٰ کے متکبر اور جابر سرمایہ داروں کا ذکر ہے۔ عربی میں جبال بڑے لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف استعارہ ہے بلکہ محاورہ بھی ہے۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ انقلاب کے وقت کوئی بھی بڑا اور سرکش ہو گا تو اللہ اسے اکھاڑ پھینکے گا۔[25] علامہ رحمت اللہ طارق کے نزدیک یہاں جبال سے مراد پہاڑ نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد بڑے لوگ ہیں۔ محاورے میں بھی بڑے لوگوں کے لیے جبال کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرما رہے ہیں کہ انقلاب کے وقت کوئی سرکش رکاوٹ بنے گا تو اللہ اسے نیست و نابود کر دے گا۔

ذکر کا معنیٰ:

متعدد آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ میں ذکر الٰہی کے فضائل آئے ہیں۔ چناں چہ درج ذیل آیت مبارکہ میں ذکر کے متعلق ارشاد ربانی ہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَه مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔[26] ترجمہ: اور جو میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی بھی تنگ ہو گی۔ علامہ رحمت اللہ طارق اس آیت میں ذکر کا معنی قانون معیشت کرتے ہیں۔ چناں چہ وہ رقم طراز ہیں:

وجہ اعتراض: کہا جاتا ہے کہ آیۂ زیر بحث کی رو سے گناہوں سے روزی کم ہو جاتی ہے جس سے اللہ کا بلا امتیاز روزی رسانی کا قانون مفلوج ہو جاتا ہے۔

قول فیصل: یہاں قرآن نے کسب معاش کا جو قانون بنایا ہے اس کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے میرے "قانون معیشت" سے اعراض کیا اور دیگر ناجائز ذرائع معیشت کا سہارا لیا اب خواہ لاکھوں کروڑوں کمائے ہوں وہ سب کے سب ناجائز اور حرام کمائی کا ماحصل ہوں گے۔ ضنک ایسی دولت کو کہتے ہیں جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔[27] علامہ رحمت اللہ طارق کے نزدیک کسب معاش کے اس قانون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس نے باری تعالیٰ کے اس قانون سے اعراض کیا اور دیگر ذرائع سے روزی حاصل کی وہ کمائی ہوئی دولت حرام ہو گی۔ یعنی ان کے نزدیک ذکر سے مراد قانون معیشت ہے۔

قطع ید (چوری میں ہاتھ کاٹنے) کا معنیٰ:

اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جامع دین ہے جس میں زندگی کے تمام تر شعبوں اور پہلوؤں کے متعلق احکام موجود ہیں۔ دین معاشرے اور معاشرتی صلاح و فلاح کے لیے نقصان دہ جرائم کی روک تھام کو یقینی بناتا ہے نیز لوگوں کی جان، مال اور عزت کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ معاشرتی جرائم پر ان کی سنگینی کے بقدر سخت سے سخت سزا مقرر کرتا ہے۔ چناں چہ چوری چونکہ ایک سنگین معاشرتی جرم ہے لہذا اس کے سد باب کے لیے اسلام میں نہایت سخت سزا مقرر ہے۔ تاہم ایک اور آیت قرآنی میں حرج کی نفی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔[28] ترجمہ: "اس نے دین میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی"۔

اس آیت میں چوری کی اس سزا کے حوالے سے علامہ رحمت اللہ طارق درج بالا آیت کے تحت لکھتے ہیں: "عرب میں چور کا ہاتھ کاٹنے کا رواج اسلام سے پہلے تھا۔ ودیک نامی چور نے کعبۃ اللہ طلائی اثاثے چوری کیے تھے پکڑا گیا اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ عرب اس سے پہلے اس سزا سے آشنا ہی نہیں تھے۔ بعد میں اسلام نے اس کا اعتراف کیا۔ اور فرمایا السارق و السارقۃ فاقطعوا ایدیھما لیکن ساتھ ہی نکالا من اللہ فرما کر قطع کو نئے مفہوم سے آشنا کرایا یعنی چور کو ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر اس کی چوری کا راستہ قطع کرنا، یا جیل بھیج کر مقررہ مدت تک "روک" میں رکھنا"۔[29] علامہ رحمت اللہ طارق قطع ید سے ہاتھ کاٹنا مراد نہیں لیتے بلکہ اسے ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر روکنا مراد لیتے ہیں خواہ اسے جیل ہی کیوں نہ بھیجنا پڑے۔ چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا اسلام کی آمد سے پہلے کی بات ہے۔

ہدہد سے مراد:

ہدہد نام کا ایک پرندہ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں تھا۔ ایک موقع پر جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے غائب پایا تو انہیں ناگواری ہوئی لہذا اسے سخت سزا دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں بیان فرمایا ہے: "وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَذْبَحَنَّهٗ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ"۔[30] ترجمہ: اور پرندوں کی حاضری لی تو کہا کیا بات ہے جو میں ہدہد کو نہیں دیکھتا کیا وہ غیر حاضر ہے۔ میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا یا وہ میرے پاس کوئی صاف دلیل بیان کرے۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ رحمت اللہ طارق لکھتے ہیں:

وجہ اعتراض: کہا جاتا ہے کہ ہدہد ایک پرندہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سدھایا ہو پرندہ ہے۔ کسی شرعی امر کا مکلف نہیں۔ اس کے لیے سنگین سزا کس لیے؟

قول فیصل: ہدہد شاہی خبر رساں اور خفیہ ادارے کے افسر اعلی کا نام تھا۔ جو افواج کے معاینے کے وقت موجود نہ تھا۔ جب کہ اتنے اہم منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے ایک اہم تقریب میں اسے حاضر ہونا چاہئے تھا۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ رحمت اللہ طارق نے ہدہد سے ایک پرندہ مراد لینے کی بجائے کوئی خبر رساں اور خفیہ ادارے کا کوئی اعلیٰ افسر مراد لیا ہے۔

لہوالحدیث سے مراد:

گانا بجانا اور رقص و سرور کی مجالس کے بارے میں اسلام کے کیا احکامات ہیں، اس بارے میں قرآن پاک کی درج ذیل آیت سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ چناں چہ ایک آیت مبارکہ میں ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ۔[31] ترجمہ: اور بعض ایسے آدمی بھی ہیں جو کھیل کی باتوں کے خریدار ہیں۔

اس آیت کے ذیل میں رحمت اللہ طارق موسیقی حلال یا حرام؟ کے عنوان کے تحت "لہو الحدیث" کا معنی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: آیتِ ہذا میں "لہوالحدیث" سے گانا یا موسیقی مراد لینا صریح تحریف یا قرآن میں ایسی چیز کا اضافہ کرنا ہے جسے قرآن ہضم ہی نہیں کر سکتا۔ مانا کے خرابیاں ہوں گی مگر یہ مسئلہ قرآن کا نہیں۔ محدثین اور فقہاء کا ہے۔ قرآن نہ تو انسان کی حسی رغبات کو کچلتا ہے اور نہ کچلنے دیتا ہے۔ وہ خرابی کو خرابی کی حیثیت سے دور کرتا ہے مگر غیر فطری ہتھکنڈوں سے ختم نہیں کرتا۔ فنون لطیفہ، مصوری، موسیقی اور طربیہ رقص انسان کی حسی رغبات سے مربوط ہیں۔ پابندی کے قواعد وضوابط صاف اور صریح ہونے چاہئیں۔ استدلالات کی کج بحثی کسی کے لیے شریعت نہیں بن سکتی۔ لہٰذا میرے نزدیک "لہو الحدیث" کا تعلق نہ گانے بجانے سے ہے اور نہ ہی طربیہ رقص اور موسیقی وغیرہ کی ممانعت سے۔[32]

علامہ صاحب کے نزدیک موسیقی کا تعلق انسان کی حسی رغبات سے ہے اور اسلام کسی کی حسی رغبات کو کچلتا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لہو الحدیث سے مراد طربیہ رقص اور موسیقی نہیں ہے۔

تکویر الشمس کا معنیٰ:

یہ کائنات اور اس میں موجودات فانی ہیں۔ زمین اور اس کے پیٹ اور پشت پر موجود تمام مخلوقات، آسمان اور اس کی بلندیوں میں ہر چیز ایک دن ختم ہو جائے گی۔ سورج، چاند اور ستارے ہر چیز فنا کی اس کی چکی میں پیس دیئے جائیں گے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی ذات لایزل کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ چناں چہ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ"۔[33] ترجمہ: جب سورج کی روشنی لپیٹی

جائے۔ رحمت اللہ طارق اس آیت کے تحت تکویرِ شمس کا معنٰی یوں بیان کرتے ہیں:" یہاں تکویر سے "سورج پرستوں" کی بساط لپیٹے جانا مراد ہے جو سیاسی زوال کا استعارہ ہے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ عجم میں مجوسی رواج ہوا اور اسلامی حاکمیت کا آغاز ہوا"۔[34]

علامہ رحمت اللہ طارق اس مقام پر تکویر شمس سے سیاسی زوال مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے سورج پرستوں کا زوال مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجوس فارس کو شکست دی اور مسلمانوں کو فتح سے بہرہ یاب فرمایا۔

یوم موعود سے مراد:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے جنت میں مسکن عطایا فرمایا پھر اپنی حکمت کے تحت انہیں اس دنیا میں مبعوث فرما کر اپنا نائب منتخب کیا۔ لیکن یہ دنیا صرف دار العمل ہے یہاں جن وانس کو عمل کرنے کا پابند بنایا گیا ہے۔ گویا جن وانس اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے دائرے میں مقید ہیں۔ پھر ان احکامات پر عمل کرنے اور نہ کرنے پر جزاء کے حوالے سے ایک دن مقرر کیا گیا جسے قیامت کا دن کہا جاتا ہے۔ بے شمار آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قیام قیامت اور احوالِ قیامت کا ذکر موجود ہے۔ چناں چہ درج ذیل قرآنی آیات میں بھی روزِ قیامت کی بات کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:"وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ"[35] ترجمہ: "اور اس دن کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اس کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں"۔ رحمت اللہ طارق ان آیات کی تفسیر کے تحت "یوم موعود" کے معنی روز قیامت ہونے کی نفی کرتے ہیں بلکہ اس سے مراد فتح مکہ کا وعدۂ الٰہیہ مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: یہاں "یوم موعود" سے مراد قیامت مراد نہیں ہے۔ وہ دن ہے جس میں اللہ نے مکہ فتح کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ خاص کر یہ آیات نازل بھی مکہ ہی میں ہوئی تھیں مگر اس وقت مکہ مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں تھا۔ لیکن اللہ کا وعدہ ہنوز تکمیل طلب تھا۔ اور جب مکہ فتح ہو گیا تو فرمایا: آج مکہ فتح ہو گیا۔ یہ اللہ کے وعدے کی تکمیل کا دن ہے۔ اور یہ دن گواہ ہے۔[36] علامہ صاحب کے نزدیک اس سے مراد فتح مکہ کا دن ہے۔

جمہور کا موقف:

علامہ رحمت اللہ طارق نے بعض مقامات پر ایسے لغوی معانی بیان کیے ہیں جو جمہور کے بیان کردہ معانی سے مطابقت رکھتے ہیں اور جمہور کے بیان کردہ معانی کو ہی انہوں نے اختیار کیا ہے۔ جبکہ بعض جگہ وہ جمہور کے نظریات سے انحراف کرتے ہیں اور صدیوں سے مسلمہ معانی و مفاہیم پر سخت نقد کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا امثلہ میں سے "وارث، غل، امر اور استغفار" کے معانی بیان کرتے ہوئے علامہ صاحب نے جمہور سے موافقت کی ہے تاہم جن الفاظ میں انہوں نے جمہور سے اختلاف کرتے ہوئے نئے معانی بیان کیے ہیں ذیل میں ان کے حوالے سے اقوالِ سلف کے بیان کردہ معانی کی روشنی میں موازنہ کیا گیا ہے۔

جبال کا معنٰی:

جبال جبل کی جمع ہے اور جبل زمین کے اونچے اور اور طویل حصے کو کہتے ہیں۔[37] اگر چہ اسی مادے سے یہ لفظ دوسرے معانی میں بھی مستعمل ہے۔ مگر قرآن وحدیث اور کلام عرب میں لفظ "جبل" اور اس کی جمع "جبال" پہاڑ کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے، بالخصوص آیت مذکورہ میں جبال پہاڑ کے معنٰی میں ہے چناں چہ اس سے اگلی آیت کو دیکھ لیا جائے تو اس سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ یہاں جبال پہاڑ کے معنی میں ہے۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:"فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا"[38] ترجمہ: پھر زمین کو چٹیل میدان کر کے چھوڑے گا۔

اس آیت مبارکہ میں دو الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ قاع اور صفصف۔ ان دونوں الفاظ کے لغوی معانی بھی "جبال" کے معنٰی میں

ہونے کی تائید کرتے ہیں۔ چناں چہ لغت میں قاع کا معنی ہے:"المستوي من الأرض"۔[39] ترجمہ: ہموار زمین۔ علامہ عبد الرحمن بن علی الجوزی ایک حدیث کی تشریح کے دوران لفظ "قاع" کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"أَرض حرَّة لَا رمل فِيهَا وَلَا يثبت فِيهَا المَاء لاستوائها وَلَا غدر فِيهَا تمسك المَاء فَهِيَ لَا تنْبت الْكلأ وَلَا تمسك المَاء"۔[40] ترجمہ:"ایسی گرم زمین جس میں ریت نہ ہو اور ہموار ہونے کی وجہ سے اس میں پانی نہ ٹھہرتا ہو۔ اور اس میں پانی روکنے کے لیے کوئی تالاب نہ ہو۔ چنانچہ قاع ایسی زمین کو کہتے ہیں میں جس میں کوئی گھاس نہ اُگے اور نہ ہی پانی اس میں رکے۔ صفصف کا معنیٰ بھی قاع سے ملتا جلتا ہے۔ چناں چہ اس کا معنیٰ یوں بیان کیا گیا ہے:مَلْساء مُستَوِية[41] ترجمہ: چکنی ہموار زمین۔ قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر لفظ "جبال" مستعمل ہے اور وہاں بھی پہاڑ کے معنیٰ میں ہی مستعمل ہے۔ چناں چہ ارشاد باری ہے:"وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ"[42] ترجمہ: اور پہاڑ رنگی ہوئی دھنی ہوئی اون کی طرح ہوں گے۔ اس آیت مبارکہ میں بھی روزِ قیامت کی ہولناکی کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ دن اس قدر شدید اور اندوہ ناک ہو گا کہ اس روئے زمین پر قائم اور زمین کو ایک تھامے رکھنے کی غرض سے بنائے گئے بلند وبالا پہاڑ بھی روئی کی گالوں کی طرح ہوا میں اڑ رہے ہوں گے۔ اس پس منظر میں "جبال" سے پہاڑوں کی بجائے بقول علامہ رحمت اللہ طارق "ماضی کے فراعنہ اور حال کے قوم موسیٰ کے متکبر اور جابر سرمایہ دار" کیسے مراد لیا جاسکتا ہے؟

نیز احادیث مبارکہ میں بھی "جبال" کا لفظ کثرت سے مستعمل ہے۔ چناں چہ درج ذیل ایک حدیث میں بھی یہ اسی معنی میں مذکور ہے۔:"عن المغيرة بن شعبة قال ما سأل أحد النبي ﷺ عن الدجال أكثر مما سألته قال وما سؤالك. قال قلت إنهم يقولون معه جبال من خبز ولحم ونهر من ماء.قال هو أهون على الله من ذلك"[43]. حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کہا: نبی ﷺ سے دجال کے بارے میں جتنا میں نے پوچھا، اس سے زیادہ کسی نے نہیں پوچھا، آپ نے فرمایا: "تمھارے سوال کا (سبب) کیا ہے؟" میں نے عرض کیا وہ (لوگ) کہتے ہیں کہ اس کے ہمراہ روٹی اور گوشت کے پہاڑ اور پانی کا دریا ہو گا۔ فرمایا: "وہ اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ حقیر ہے۔

ان تمام تر لغوی شہادتوں اور قرآن و حدیث کی نصوص سے کسی بھی طرح علامہ صاحب کے بیان کردہ معنیٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ لغوی منہج تفسیر کا یہ پہلو بلاشبہ مذموم ہے جس میں سیاق وسباق اور دیگر ماثور لغوی تائیدات سے صرف نظر کرتے ہوئے محض عصری حالات کو اپنے تئیں سدھارنے کی غرض سے قرآن کے معانی میں تکلف سے کام لیا جائے۔ قرآن فہمی کے لیے صرف لغوی معانی یا عصری حالات وواقعات کو بنیاد بنانا کافی نہیں ہے بلکہ سیاق وسباق اور کلام کے مخصوص پیرائے کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔

ذکر کا معنیٰ:

لفظ "ذکر" بھی قرآن وحدیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ علامہ رحمت اللہ طارق نے "ذکر" کا معنی "قانون معیشت" سے کیا ہے۔ اس معنیٰ کی تائید نہ تو لغت سے ہوتی ہے اور نہ ہی قرآن وحدیث کی نصوص سے۔

چناں چہ لغوی اعتبار سے اس کا اصل معنیٰ ہے یاد کرنا۔ چناں چہ ابن منظور ذکر کا معانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"الذِّكْرُ الحِفْظُ للشيءِ تَذْكُرُه والذِّكْرُ أَيضاً الشيءِ يجري على اللسان"[44] ترجمہ: ذکر کا معنیٰ ہے کسی چیز کو یاد کرنا، نیز ذکر اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو زبان پر جاری ہو۔ فراء نے بھی ذکر کا معنیٰ اسی سے ملتا جلتا کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:"الذِّكْرُ ما ذكرته بلسانك وأَظهرته والذُّكْرُ

بالقلب"[45] ترجمہ:"ذکر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا تو اپنی زبان سے تذکرہ کرے اور اسے ظاہر کرے۔ اور ذکر دل سے بھی ہوتا ہے"۔ چنانچہ لفظ "ذکر" کا اصل معنیٰ تو مطلقاً کسی بھی چیز کو یاد کرنا ہے مگر جب یہ ایک مخصوص پیرائے میں مستعمل ہو یعنی اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کی جائے تو اس کا معنیٰ ہوتا ہے یاد الٰہی یعنی اللہ کو یاد کرنا۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ[46] ترجمہ: پس مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔ ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے: فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ[47] ترجمہ: پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہونے کی حالت میں یاد کرو۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: "اس سے مراد یہ ہے کہ زخمی حالت میں، مرض کی حالت میں کھڑے بیٹھے ہر حالت میں اللہ کو یاد کرو۔"[48]

اسی طرح کی اور بہت سے آیات مبارکہ میں ذکر کا لفظ یاد الٰہی کے معنیٰ میں آیا ہے۔ نیز احادیث مبارکہ میں بھی ذکر کے جو فضائل بیان کیے گئے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس سے مراد اللہ کو یاد کرنا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد نبوی ہے: "مثل الذي يذكر ربه والذي لا يذكر ربه مثل الحي والميت"۔[49] ترجمہ: اپنے رب کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔ ایک اور حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "مثل البيت الذى يذكر الله فيه والبيت الذى لا يذكر الله فيه مثل الحى والميت"۔[50] ترجمہ: اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر کیا جائے اور جس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جائے زندہ اور مردہ کی سی ہے۔ ان دونوں فرامین رسول ﷺ میں ذکر سے ذکر الٰہی اور یادِ الٰہی سے ہٹ کر کسی اور معنی کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے یہاں تو واضح طور پر اس لفظ کو یاد الٰہی کے لیے ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح جس آیت کی تفسیر میں علامہ رحمت اللہ طارق نے ذکر سے مراد "قانون معیشت" لیا ہے وہاں بھی ذکر کی نسبت اللہ نے اپنی طرح کی ہے اور ذکری فرمایا ہے جو علامہ صاحب کے اختیار کردہ معنی کی تائید سے انکاری ہے۔ لہٰذا لفظ ذکر سے قانون معیشت مراد لینا محض تکلف ہے۔

قطع ید (چوری میں ہاتھ کاٹنے) کا معنیٰ:

معاشرے کا سماجی ڈھانچہ پانچ چیزوں پر اُستوار ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں خلل آجائے تو اس سے معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں، اس کا امن وسکون غارت ہو جاتا ہے اور معاشرے کا ہر فرد کرب اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ پانچ چیزیں یہ ہیں: عقیدے کا تحفظ، نسب کا تحفظ، عزت و آبرو کا تحفظ، جان کا تحفظ اور املاک کا تحفظ۔ چناں چہ اسلامی حدود و قصاص اور شرعی تعزیرات کی مشروعیت کا اہم مقصد انہیں پانچ چیزوں کا تحفظ ہے، انہیں مقاصد شریعت کہا جاتا ہے۔

نیز اسلامی احکامات پر از حکمت اور تاقیامت ہر علاقے اور ہر رنگ ونسل کے لوگوں کے لیے قابل عمل ہیں۔ اسی طرح اسلامی سزائیں بھی نہایت حکیمانہ اور جرائم کی سنگینی اور خفت کے عین مطابق ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی عمومی جرم پر کوئی سخت سزا مقرر کر دی گئی ہو یا کسی سنگین جرم پر نہایت نرم سزا رکھ دی گئی ہو۔ چوری چونکہ ایک معاشرتی جرم ہے لہذا چوری کی سزا بھی قدرے سخت مقرر کی گئی ہے اور ایک مخصوص مقدار میں کسی کے مال کو چوری کرنے پر چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے: "وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ"[51] ترجمہ: اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ، سزا میں ان کی کمائی کی، تنبیہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔

اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنا صفاتی نام "حکیم" ذکر فرمایا ہے۔ گویا چور کا ہاتھ کاٹنے کو اللہ نے اپنی حکمت قرار دیا ہے

کیونکہ اس میں پورے معاشرے کے حفظ مال کا مقصد پنہاں ہے۔ علامہ رحمت اللہ طارق نے اس ''قطع ید'' سے مراد'' چور کو ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر اس کی چوری کا راستہ قطع کرنا، یا جیل بھیج کر مقررہ مدت تک روک میں رکھنا'' لیا ہے۔ گویا علامہ صاحب نے یہاں قطع روکنے کے معنیٰ میں لیا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ کے دور مبارک سے آج تک امت مسلمہ اس آیت میں ''قطع ید'' کو معروف معنی پر محمول کرتی آئی ہے اور ہاتھ کاٹنا ہی اس کا معنیٰ سمجھا جاتا رہا ہے۔ کتب لغت میں بھی قطع کا یہی معنی ذکر کیا گیا ہے۔ ابن منظور لکھتے ہیں:"القَطْعُ إبانةُ بعض أَجزاء الجِرْمِ من بعضٍ"۔[52] ترجمہ: قطع کا معنیٰ ہے جسم کے کسی عضو کو دوسرے سے الگ کر دینا۔

نیز کثیر احادیث اور آثار اس معنیٰ پر دال ہیں۔ چناں چہ ایک حدیث مبارکہ میں تو قطع ید کے لیے چوری شدہ مال کی مقدار بھی متعین کی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف میں مروی ہے:"القطعُ في ربع دِينارٍ فصاعدًا"[53] ترجمہ: قطع ید چوتھائی دینار اور اس سے زیادہ مالیت میں ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ مقدار سرقہ کتنی ہے جس پر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ تمام فقہاء کے ہاں قطع ید ہاتھ کاٹنے کے معنیٰ میں ہے نہ کہ بیڑیاں یا ہتھ کڑیاں پہنانا یا جیل میں ڈال کر اس کی چوری کا راستہ روکنا۔ اسی طرح بغوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:"تُقْطَعُ يَدُهُ الْيُمْنَى من الكوع"۔[54] ترجمہ: چور کا دایاں ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے گا۔

اس تفسیر میں ''کوع'' کا لفظ بھی مذکور ہے جس کا معنیٰ ''کلائی'' ہے۔ بغوی کی اس تفسیر کی روشنی میں علامہ رحمت اللہ طارق کا اختیار کردہ معنیٰ کیسے مراد لیا جا سکتا ہے؟ کیوں کہ بیڑیاں پہنانے اور جیل میں ڈالنے کے معنیٰ میں ''کلائی'' کا معنی منطبق کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، لہذا لغت کسی طرح بھی اس معنیٰ کی تائید نہیں کرتی۔ قرآن حکیم میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:"اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ[55] ترجمہ: ان کی بھی یہی سزا ہے جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں یہ کہ انہیں قتل کیا جائے یا وہ سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں، یہ ذلت ان کے لیے دنیا میں ہے، اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت میں قتل، ڈاکے اور چوری کے مختلف جرائم کی بحساب نوعیت جرم سزائیں بیان کی گئی ہیں جس میں چند ایک الفاظ سے علامہ صاحب کے اختیار کردہ معنیٰ کی برملا نفی ہو رہی ہے۔ مثلاً اس آیت مبارکہ میں ''من خلاف'' کے الفاظ موجود ہیں جس کا معنیٰ ہے کہ ہاتھ پاؤں الٹی طرف سے کاٹنے ہیں، یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض اہل علم نے '' يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ'' سے مراد قید کرنا لیا ہے۔ چناں چہ ابن کثیر رقمطراز ہیں:"الْمُرَادُ بِالنَّفْيِ هَاهُنَا السِّجْنُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَأَصْحَابِهِ، وَاخْتَارَ ابْنُ جَرِيرٍ: أَنَّ الْمُرَادَ بِالنَّفْيِ هَاهُنَا: أَنْ يُخْرَجَ مِنْ بَلَدِهِ إِلَى بَلَدٍ آخَرَ فَيُسْجَنَ فِيهِ"۔[56] ترجمہ: یہاں نفی سے مراد قید کر دینا ہے یہ قول امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ اور ابن جریر کے نزدیک مختار یہ ہے کہ یہاں نفی سے مراد ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بھیج دینا اور وہاں قید کر دینا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق ''قطع ید'' کے بعد ''نفی ارض'' سے مراد جب قید کرنا ہے تو پھر ''قطع ید سے یہی معنی کیونکر مراد ہو سکتا ہے؟ ورنہ پے در پے دو الفاظ ایک معنیٰ کے حامل ہوں گے جو کہ بے فائدہ تکرار ہے۔ نیز ''يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ'' کا ما قبل '' تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ'' پر عطف ہے اور معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے، لہذا ان دونوں جملوں سے ایک نہیں بلکہ الگ الگ معنیٰ مراد ہو گا۔ لہذا مذکورہ بالا لغوی اور تفسیری شہادات علامہ رحمت اللہ

طارق کے ذکر کردہ معنی کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ہدہد سے مراد:

سلیمان علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں، قرآن حکیم میں ان کے محیر العقول واقعات مذکور ہیں۔ مختلف مخلوقات اور فضاؤں پر ان کی حکومت اور تخت سلیمانی یہ سب چیزیں قرآنی نصوص سے ثابت ہیں۔ انہی چیزوں میں ایک "ہدہد" نامی پرندہ بھی ہے جو ان کے لشکر کا حصہ تھا اور مختلف سفروں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہمراہ ہوتا تھا۔ علامہ رحمت اللہ طارق نے یہاں "ہدہد" کی مراد کے حوالے سے جمہور کے موقف سے عدول کیا اور اس سے مراد "شاہی خبر رساں اور خفیہ ادارے کا افسر" لیا ہے۔

حالانکہ نہ تو لغت اس معنیٰ کی تائید کرتی ہے اور نہ ہی آیت کا سیاق وسباق علامہ صاحب کے اس معنیٰ کی طرف مشیر ہے۔ کیوں کہ اس آیت کا آغاز "وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ" سے ہو رہا ہے، جس کا معنی ہے سلیمان علیہ السلام نے (اپنے لشکر میں شامل) پرندوں کی حاضری لی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا "طیر" بھی کسی خبر رساں ایجنسی اور خفیہ ادارے کا نام ہے جن کی سلیمان علیہ السلام حاضری لے رہے تھے کہ ان میں "ہدہد" نام کا افسر غیر حاضر تھا۔ اس بات کے تو علامہ صاحب بھی قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح اسی آیت میں ہدہد کے غیر حاضر ہونے کی صورت سلیمان علیہ السلام نے سزا کے طور پر "لَاَذْبَحَنَّهٗ" (اسے ذبح کر دوں گا) کا لفظ ارشاد فرمایا۔ چناں چہ ذبح کا لفظ بھی یہ گواہی دے رہا ہے کہ یہاں پرندہ ہی مراد ہے ورنہ انسان کو ذبح کرنا کسی مذہب میں بھی روا نہیں ہے۔ بالفرض اگر اس سے کوئی انسان مراد ہوتا تو "لاقتلنه" کے الفاظ ہوتے۔ لہٰذا عربیت کے لحاظ سے بھی یہ تاویل غیر مناسب ہے۔ نیز ایک حدیث مبارکہ میں "ہدہد" کا لفظ ایک پرندے کے معنیٰ میں مستعمل ہے:"نهى عن قتل أربع من الدواب : النملة و النحلة الهدهد و الصرد"۔[57] ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے چار جانوروں کو قتل کرنے سے منع فرمایا: چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور لٹورا (چڑیا کی ایک قسم)۔ اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے ہدہد کو دیگر تین جانوروں کے ساتھ ذکر فرمایا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہدہد سے مراد بھی جانور ہی ہے۔

لہو الحدیث سے مراد:

"لہو الحدیث" کو قرآن وحدیث میں ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد گانا بجانا، موسیقی اور وہ تمام فضول اور بے ہودہ باتیں ہیں جو انسان کو یاد الٰہی سے غافل کرنے والی ہوں۔ مگر علامہ صاحب اس معنی سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ موسیقی اور طربیہ رقص کو فنون لطیفہ کا نام دے کر انسان کی حسی رغبات قرار دیتے ہیں۔ اور موسیقی اور گانا بجانے کی قرآن وحدیث سے ثابت شدہ حرمت کو "محدثین اور فقہاء کا مسئلہ" قرار دیتے ہیں۔ مگر امت مسلمہ اجماعی طور "لہو الحدیث" سے موسیقی اور گانا بجانا مراد لیتے ہیں۔ مفسر قرطبی رقم طراز ہیں: لَهْوَ الْحَدِيثِ: الغناء ؛ في قول ابن مسعود وابن عباس وغيرهما.وهو ممنوع بالكتاب والسنة[58] ترجمہ: لہو الحدیث سے مراد ابن مسعود اور ابن عباس کے بقول گانا ہے اور گانا کتاب وسنت کی رو سے ممنوع ہے۔ قرطبی مزید لکھتے ہیں:

هذه إحدى الآيات الثلاث التي استدل بها العلماء على كراهة الغناء والمنع منه[59] ترجمہ: یہ ان تین آیات میں سے ہے جن سے علماء نے گانے کی کراہت اور ممانعت پر استدلال کیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول بھی رحمت اللہ طارق صاحب کے انحرافی موقف کی سختی سے نفی کرتا ہے اور لہو الحدیث کے اجماعی معنیٰ کی تائید کرتا ہے۔ چناں چہ ابن عطیہ نے اس آیت کی تفسیر میں متعدد تفسیری اقوال کیے ہیں ان سب اقوال میں "لہو الحدیث" کا معنیٰ گانا اور موسیقی ہی کیا گیا ہے۔ وہ اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"أنها نزلت في قرشي اشترى جارية مغنية تغني بهجاء محمد

ﷺ وسبه فنزلت الآية في ذلك، وقيل إنه ابن خطل وروي عن أبي أمامة الباهلي بأن النبي ﷺ قال:شراء المغنيات وبيعهن حرام وقرأ هذه الآية"۔[60] ترجمہ: یہ آیت اس قرشی کے بارے میں نازل ہوئی جس نے ایک مغنیہ باندی خریدی جو آپ ﷺ کی ہجو کرتی تھی اور سب و شتم کرتی تھی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کہا گیا ہے کہ یہ آدمی ابن خطل تھا۔ اور ابو امامہ باہلی سے مروی ہے کہ گانا گانے والی عورتوں کی خرید و فروخت حرام ہے اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔

ان واضح نصوص کی موجودگی میں ایک مسلمہ ناجائز عمل کو فنون لطیفہ اور انسانی حسی رغبات کا عنوان دے کر لغوی منہج اختیار کرتے ہوئے جائز قرار دینا بلاشبہ تفسیر بالرائے مذموم کے زمرے میں آتا ہے۔

تکویر الشمس کا معنیٰ:

یہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے۔ لہذا قیامت کا قیام اسلام کا ایک مسلمہ نظریہ ہے بلکہ عقیدۂ آخرت ضروریات ایمان میں سے ہے۔ قرآن و حدیث میں جا بجا قیامت اور اس میں رونما ہونے والے واقعات مذکورہ ہیں۔ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:"اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ"۔[61] ترجمہ: جب سورج کی روشنی لپیٹی جائے۔

یہاں پر رحمت اللہ طارق صاحب نے تکویر شمس سے سورج پرستوں کا سیاسی زوال مراد لیا ہے۔ گویا انہوں نے اس آیت کو مستقبل میں قائم ہونے والی قیامت کی بجائے مجوسی حکومت کے خاتمے سے جوڑا ہے۔ مجوس کی حکومت کے خاتمے سے انکار نہیں، یہ اسلام اور اہل اسلام کی بہت بڑی فتح تھی لیکن محض ایک لفظ "الشمس" کو دلیل بنا کر اس سے ایسا منفرد معنی مراد لینا درست نہیں۔ یہ ایک ایسا معنیٰ ہے کہ سلف و خلف میں سے کسی بھی اہل علم کی اس کو تائید حاصل نہیں ہے۔ ابن کثیر اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس کا قول ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:"يُكَوِّرُ اللهُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجومَ يَوْمَ الْقِيامَةِ فِي الْبَحْرِ"۔[62] ترجمہ: اللہ تعالیٰ روزِ قیامت سورج اور چاند کو لپیٹ کر سمندر میں پھینک دے گا۔ ابن کثیر مزید لکھتے ہیں:"سِتُّ آيَاتٍ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيامَةِ، بَيْنَا النَّاسُ فِي أَسْوَاقِهِمْ إِذْ ذَهَبَ ضَوْءُ الشَّمْسِ، فَبَيْنَمَا هُمْ كَذَلِكَ إِذْ تَنَاثَرَتِ النُّجُومُ، فَبَيْنَمَا هم كذلك"۔[63] ترجمہ: قیامت سے قبل چھ نشانیاں رونما ہوں گی۔ (ایک یہ ہے کہ) لوگ اپنے بازاروں میں (مصروف) ہوں گے اچانک سورج کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

امام بخاری "تکویر شمس" کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"أظلمت وتلاشى ضوؤها من التكوير وهو جمع الشيء بعضه إلى بعض فكأن الشمس عند قيام الساعة تجمع بعضها إلى بعض وتلف فيلف ضوؤها ويذهب انتشاره في الآفاق"۔[64] ترجمہ: سورج بے نور ہو جائے گا اور اس کی روشنی ختم ہو جائے گی۔ یہ تکویر سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو آپس میں اکٹھا کر دینا۔ گویا روز قیامت سورج کو بھینچ دیا جائے گا اور لپیٹ دیا جائے گا جس سے اس کی روشنی ختم ہو جائے گی اور آفاق عالم میں اس چکر لگانا ختم ہو جائے گا۔

یہ تمام تفسیرات و تشریحات "تکویر شمس" کے مخصوص معنیٰ کو متعین کر رہی ہیں اور سورج کے بے نور ہو جانے کا معنیٰ واضح کر رہی ہیں۔ جس سے علامہ رحمت اللہ طارق کے تفرد کی تردید ہوتی ہے۔

یوم موعود کی مراد:

قرآن کریم میں روزِ قیامت کو مختلف الفاظ سے بیان کیا گیا ہے، کہیں یوم الجزاء، کہیں یوم الدین، کہیں یوم القیامۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن کو "یوم موعود" کہا گیا ہے۔ ہر نام کی اپنی اپنی وجہ اور مناسبت ہے۔ مگر علامہ رحمت اللہ طارق صاحب "یوم موعود" کو قیامت کے معنیٰ میں تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے فتح مکہ کا دن مراد ہے، انہوں نے لفظ

"موعود" سے یہ معنی اخذ کیا ہے، اس طرح لغوی منہج تفسیر اختیار کرتے ہوئے انہوں نے متداول معنی سے عدول کیا ہے۔ ملت اسلامیہ کے اہل علم وفضل اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مراد روزِ قیامت ہی ہے۔ اسی طرح بے شمار احادیث مبارکہ بھی اس پر شاہد ہیں۔ چناں چہ سنن ترمذی کی روایت ہے: "عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: اليوم الموعود يوم القيامة"۔[65] ترجمہ: حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "یوم موعود" سے مراد قیامت کا دن ہے۔

یہ حدیث اور بھی بہت سی کتب احادیث میں موجود ہے، اس حدیث میں اس آیت کی تفسیر میں پیغمبر اسلام نے اس لفظ کی مراد متعین کر دی ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ لہٰذا فتح مکہ کا دن مراد لینا درست نہ ہونا فتح مکہ کا دن یا کوئی اور دن مراد نہیں ہے۔

متذکرہ بالا بحث وموازنہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی تفسیر میں لغوی منہج اختیار کیا ہے اور الفاظ کے لغوی معانی کا سہارا لیتے ہوئے اپنے تفردات اور مخصوص نظریات کو قرآنی تائید دینے کی کوشش کی ہے۔ علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی تفسیر میں نہ صرف اپنے تفردات کو قرآنی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے بلکہ جمہور اہل علم، فقہاء اور محدثین پر تنقید کرتے ہوئے استہزایہ زبان استعمال کی ہے جو کہ ایک علمی رویہ نہیں ہے۔ بلاشبہ ہر انسان کو اپنی رائے میں آزادی حاصل ہے لیکن محض اپنے نظریات کو بیان کرنے کے لیے متداول اور مشہور معانی سے بلا دلیل عدول کرنا درست روش نہیں۔ مقالہ نگار لغوی منہج تفسیر کے اردو تفسیری ادب پر اثرات کو بیان کرنا چاہتا ہے، یہ اثرات محمود و مذموم دو طرح کے ہو سکتے ہیں ان میں سے مذکورہ بالا مثال تفسیر بالرائے مذموم کے زمرے میں آتی ہے جو کہ تفسیر قرآنی کا ایک نادرست طریقہ ہے۔

خلاصۃ البحث

قرآن پاک سے استفادہ اور افادہ کے لیے جن علوم کی ضرورت پیش آتی ہے ان میں سے ایک علم لغت عربی کا علم ہے، قرآن کی زبان چونکہ عربی ہے اس لیے لغت عرب سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔ لیکن محض لغت پر اکتفاء کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ دیگر علوم کی طرح یہ بھی ایک علم ہے جو تفسیر قرآن میں مددگار ثابت ہوتا ہے، اور جب تفسیر کرتے ہوئے لغت سے خاص طور پر استفادہ کیا جائے تو تفسیر کا یہ منہج لغوی منہج کہلاتا ہے۔ عربی لغت دنیا کی دوسری زبانوں سے اس طرح بھی ممتاز ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کی نسبت وسعت زیادہ ہے، اب تفسیر قرآن میں یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ ایک لفظ کے کثیر معانی میں سے کس معنی کو لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے؟ ایک معنی کو ترجیح دی جائے تو کس بنیاد پر اور ایک معنی کو ترک کیا جائے تو کس بنیاد پر؟ اس موقع پر مفسر بارگاہ رسالت مآب ﷺ کی طرف اپنا دست سوال دراز کرتا ہے کہ کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی کی صورت میں نبی کریم ﷺ کی جانب سے جس معنی کی تائید ہو گی وہی راجح کہلائے گا اور دوسرے تمام معانی مرجوح کہلائیں گے۔ تو معلوم ہوا کہ تفسیر قرآن میں لغت عرب بھی وہی معتبر ہو گی جس کو اقوال و آثار سے تائید حاصل ہو، اور یہی امت کے اسلاف سے منقول ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر کرتے ہوئے لغت کے میدان میں آزادی سے خوشہ چینی کرنا اسلاف مفسرین کے ہاں روا نہیں ہے اور نہ ہی یہ تفسیر قرآن کا محمود طرز ہے۔

اردو تفسیری ادب میں لغوی منہج تفسیر میں محمود و مذموم دونوں طرح کا رخ پایا جاتا ہے، زیر نظر مقالہ میں اسی منہج کے مذموم پہلو کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کروائی ہے۔ اس مقصد کے لیے مقالہ نگار نے علامہ رحمت اللہ طارق کی تفسیر "میزان القرآن" کا انتخاب کیا، اس کا اسلوب و منہج بیان کیا، اور اس کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا، تحقیق کے بعد مقالہ نگار پر یہ امر واضح ہوا کہ علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی اس تفسیر میں لغوی منہج اختیار کیا ہے، لہٰذا علامہ رحمت اللہ طارق کی عبارات کو نمونے کے طور پیش کرنے کے بعد دلائل

سے ان کا رد کیا ہے۔علامہ صاحب نے اپنی اس تفسیر میں جمہور علما امت سے اختلاف کرتے ہوئے جابجا سخت رویہ اپنایا ہے جو کہ ایک محققانہ روش نہیں، مقالہ نگار نے ایسی جسارت سے اجتناب کیا ہے اور دلائل کی روشنی میں اپنا مقدمہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس تحقیقی کاوش سے کسی حد تک قارئین پر یہ عقدہ کھلے گا کہ کیونکر لغوی منہجِ تفسیر کی آڑ میں فرقِ باطلہ اپنے مذموم نظریات کو زبردستی تائید ایزدی پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان نظریات کی ترویج کرتے ہیں۔

سفارشات

- ”لغوی منہج تفسیر اور انکار حدیث، ایک تحقیقی جائزہ“ کے عنوان سے کسی جامعہ میں پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھوایا جائے۔
- ”تفسیر بالماثور میں لغت کی حیثیت“ کے عنوان پر ایم۔فل کی سطح پر تحقیقی کام کروایا جائے۔
- ”میزان القرآن از رحمت اللہ طارق کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ“ کے عنوان پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھوایا جائے۔
- ”منسوخ القرآن از رحمت اللہ طارق کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ“ کے عنوان پر پی۔ایچ۔ڈی کی سطح پر کام کروایا جائے۔
- ایسی قرآنی لغت پر تحقیقی پراجیکٹ کروایا جائے جس میں ہمہ قسم کے لغوی معانی کو درج کر دیا جائے تاکہ جمہور کے اختیار کردہ معانی اور دیگر محققین کے تفردات ایک جگہ پر جمع ہو جائیں اور ان پر مزید تحقیقی کام کرنا آسان ہو۔
- اردو تفسیری ادب میں لغوی منہج تفسیر کو سرکاری سطح پر فروغ دیا جائے تاکہ آئے روز پیدا ہونے والے فتنوں کا سدباب کیا جا سکے۔
- مقتدر اہل علم حضرات کو چاہیے کہ اردو زبان میں لغوی منہج تفسیر پر ایک ایسی تفسیر مرتب کی جائے جو بسط و جمع ہر دو خوبیوں پر مشتمل ہو تاکہ دور حاضر کی فکری و علمی لغزشوں کی نشان دہی کر کے امت کو گمراہی میں پڑنے سے بچایا جا سکے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

حوالہ جات(References)

[1] روزنامہ آفتاب،27اکتوبر2018ء ص4۔

Daily Aftāb,27October2018. P.4

[2] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان، سن ندارد: ص41۔

Rahmatullah Tāriq,Tafseer Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān, Idāra Adbiyāt e Islamia, Multān, Date is not mentioned)P.41.

[3] القرآن 107:10

Al-Qurʻān 10:107

[4] تفسیر میزان القرآن، ص160

Tafseer al Mizan al Quran:p160

[5] القرآن 13:34

Al-Qur ʻān 34:13

[6] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ص270

Rahmatullah Tāriq, Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān, P.270

[7] ایضاً،414۔

Ibid.414.

[8] ایضاً،477۔

Ibid.P.477.

[9] ایضاً،494۔

Ibid.494.

[10] ایضاً،501تا519۔

Ibid.501 to 519.

[11] ایضاً،522۔

Ibid.522.

[12] ایضاً،531۔

Ibid.531.

[13] ایضاً،534۔ Ibid.534.

[14] ایضاً،538۔ Ibid.538.

[15] القرآن23:15 Al-Qur ʻān 15:23

[16] رحمت اللہ، تفسیر میزان القرآن ص188۔ Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān,P.188

[17] القرآن47:15 Al-Qur ʻān 15:47

[18] رحمت اللہ، تفسیر میزان القرآن ص189۔ Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qurʻān,P.189.

[19] القرآن16:17 Al-Qur ʻān 17:16

[20] القرآن27:7 Al-Qur ʻān 7:27

[21] رحمت اللہ، تفسیر میزان القرآن ص202 Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān,P.202.

[22] القرآن47:19 Al-Qur ʻān 19:47

[23] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن ص211 Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān.P.211

[24] القرآن:10520-104 Al-Qur ʻān 20:104-105

[25] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ص217 Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān,P.217.

[26] القرآن124:20 Al-Qur ʻān 20:124

[27] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ص217 Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Quran.P.217

[28] القرآن78:22 Al-Qur ʻān 22:78

[29] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ص224 Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān,P.224

[30] القرآن20:27 Al-Qur ʻān 27:20

[31] القرآن6:31 Al-Qur ʻān 31:6

[32] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ص254 Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān,P.254.

[33] القرآن1:81 Al-Qur ʻān 81:1

[34] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ص351 Rahmatullah Tāriq,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān,P.351.

[35] القرآن2-3:85 Al-Qur ʻān 85:2-3

[36] رحمت اللہ طارق، تفسیر میزان القرآن، ص357 Rahmatullah,Tafsīr Mīzan ul Qur ʻān, P357.

[37] المرسي، علي بن إسماعيل بن سيده، المحكم والمحيط الأعظم، دار الكتب العلمية، بيروت، 1421ھ، ج7ص440

Al Marsi,Ali bin Ismaīl bin sayyida, Almuhkam wal Muhīt ul Azam,Dār ul Kutub ul Ilmiya, Beirut, 1421AH, 7:440.

[38] القرآن106:20 Al-Qur ʻān 20:106

[39] الجوهري، إسماعيل بن حماد، الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية، دار العلم للملايين، بيروت, 1407ھ:ج3ص1274

Al Johari,Ismaīl bin Hammād,Al-Sihāh Tāj ul Lugha wa Sihāh ul Arabiyyah, Dār ul Ilm lil malāeīn, Beirut,1407AH, 3:1274

[40] الجوزي، عبد الرحمن بن علي بن محمد، غريب الحديث، دار الكتب العلمية، بيروت، 1405ھ:ج2ص272

Al-Jauzi, Abdurrahmān bin Ali bin Muhammad, Gharīb ul Hadīth, Darulkutub al ilmiya, Beirut,1405H, 2:272.

[41] المرسی، المحكم والمحيط الأعظم، ج8ص273 Al-Marsi, Almuhkam wal Muhīt ul Azam,8:273.

[42] القرآن5:101 Al-Qur ʻān 101:5

[43] القشيری, مسلم بن الحجاج، الجامع الصحيح المسمى صحيح مسلم، دار الجيل، بيروت، س ن، رقم الحديث:7566

Al-Qusheri, Muslim bin Hajjāj, Aljāmy al Sahih al musamma sahih Muslim, Darul Hiyal, Publishing, Beirut, Hadith No7566

[44] ابن منظور، محمد بن مكرم، لسان العرب، دار صادر، بيروت، س ن:ج4ص308

Ibn e Manzoor,Muhammad bin Mukarram, Lisān ul Arab, Dar e Sādir,Publishing, Beirut, 4:30

[45] ایضاً 308:4 Ibid. 4:308.

[46] القرآن152:2 Al-Qur ʻān 2:152

[47] القرآن 4:103 — Al-Qur ʻān 4:103

[48] ابن عباس، عبداللہ، تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، س ن: ص 79

Ibn e Abbās, Abdullah,Tanwīr ul Miqbās min Tafsīr e Ibn e Abbās, Dar ul Kutub il Ilmiya, Beirut, P.79.

[49] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، دار طوق النجاۃ، بیروت، 1422ھ: رقم الحدیث: 6044

Al-Bukhari, Al Jamy Al Sahih, Muhammad bin Ismaeel, Hadith No 6044.

[50] مسلم، الجامع الصحیح، رقم الحدیث: 1859 — Muslim,Al-Jamy Al- Sahih,Hdith No1859

[51] القرآن 5:38 — Al-Qur ʻān 5:38

[52] ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، ج 8، ص 276 — Ibn e Manzoor,Muhammad Bin Mukarram, Lisān ul Arab,8:276

[53] الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ج 10 ص 295 — Al-Tabrī, Muhammad bin Jarīr, Jāmy ul Bayān Fī Tawīl il Qur ʻān,10:295

[54] البغوی، حسین بن مسعود، معالم التنزیل فی تفسیر القرآن، دار احیاء التراث العربي، بیروت، 1420ھ: ج 2 ص 46

Al- Baghwī, Al-Husain bin Masood, M ʻaā lim ul Tanzīl Fī Tafsīr il Qur ʻān, Dār Ihya Al-Turās Al Arbi, Beirut,1420H, 2:46

[55] القرآن 5:33 — Al-Qur ʻān 5:33

[56] ابن کثیر، إسماعیل بن عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، بیروت، 1420 ھ: ج 3 ص 101

Ibn e Kasīr, Ismā ʻaīl bin Umar bin Kasīr, Tafsīr ul Qur ʻān al Azīm, Dār Tiba Lilnashr e Waltozee, Beirut,1422H) ī3:101

[57] البانی، ناصر الدین، صحیح وضعیف الجامع الصغیر، المکتب الإسلامي، بیروت، س ن: رقم الحدیث: 12926

Albānī,Nāsir ul Din,Sahih wa Zaīf Al-Jāmy Al-Saghīr, Almaktab Al-Islāmi,Publishing, Beirut, Hadīth No:12926

[58] القرطبی، محمد بن أحمد، الجامع لأحکام القرآن، دار عالم الکتب، ریاض، 1423ھ: ج 4 ص 15

Al-Qurtabī,Muhammad bin Ahmad, Al- Jāmy Li Ahkamil Qur ʻān, Dār ʻaālam Al-kutub, Riādh، 1423H, 4:15

[59] ایضاً، 14:51 — Ibid. 14:51

[60] الاندلسی، ابن عطیہ، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، 1422ھ: ج 4 ص 345

Al Undlusi Ibn e Atya, Al-Muharar Al wajīz fī Tafsīr Alkitab il Azīz, Dār Alkutub Al Ilmiya, Beirut, 1422H)4:345

[61] القرآن 81:1 — Al-Qurʻān 81:1

[62] ابن کثیر، إسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، ریاض، 1420ھ: ج 8 ص 329

Ibn e Kasīr, Ismāʻa īl bin Umar, Tafsīr Al- Qurān Al- azīm, Dār Tiba Lil nashr e Waltozee، Riādh :8:329

[63] ایضاً، 8:329 — Ibid. 8:329.

[64] البخاری، الجامع الصحیح، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ اذا الشمس کورت، ج 1 ص 1882

Al- Bukhāri, Al-Jāmy Al-sahīh, Kitāb ul Tafsīr,Bāb Tafsīr Surah Takwīr,4:1882

[65] الترمذی، السنن، رقم الحدیث 3339 — Al-Tirmazī, Al-Sunan,Hadīth No3339